مولانا ابوالکلام آزاد (حالات، افکار، خدمات)

عبدالقادر بزدار*

محمد انس حسان**

۱۹۴۷ء میں برعظیم کی تقسیم اور قیام پاکستان کے بعد ایک طبقہ نے جس فکری علیحدگی پسندی کو فروغ دیا، اس نے حق وانصاف کے ساتھ سوچنے کے کے دریچے ہی بند کر دیئے اور سیاسی اختلاف رائے کو جب ارتداد قرار دیدیا جائے تو وہ معاشرہ کو بانجھ بنانے کی کوشش ہوتی ہے، پھر ایسے معاشرے میں وسعت نظری عنقا اور بلند نگہی مفقود ہو جاتی ہے اور یوں وہاں بات بات پر کافر قرار دینے اور اہل سطوت وحشمت سے اختلاف کو غداری اور ملک دشمنی قرار دینے کی روایت فروغ پاتی ہے۔ لیکن حق کے متلاشی افراد اس گھمبیر صورتحال میں بھی جستجو، دریافت اور طلب حق سے باز نہیں آتے اور ان کی یہی سعی، ظلمتوں کے پردے چاک کرنے کی نوید بن کر آتی ہے۔ قوموں کی زندگی کا راز اس میں پنہاں ہے کہ وہ اپنے سچے راہنماؤں کو پہچانے، ان کی قربانیوں کو صدقِ دل سے تسلیم کرے، کسی بھی ایک پہلو سے اتفاق نہ رکھنے کے باوجود اس کے فکر وعمل کے دیگر گوشوں کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔ جبکہ زوال آشنا معاشرے آلہ کار راہنماؤں کو مقدس گردانتے ہیں اور سچ کہنے والے زعماء ان کی نظر میں انتہائی کم تر درجہ کے حامل ہوتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) کا شمار ان نابغہ روزگار شخصیات میں ہوتا ہے، جن کے چھوڑے ہوئے نقوش پر چل کر قومیں اپنا مستقبل بناتی اور سنوارتی ہیں۔ انہی کے افکار وخیالات پر ملت کا قیاس اور قوم کا اعتقاد ہوتا ہے اور یہی لوگ تند وتیز طوفانوں اور ظلمت وتاریکی میں قوموں کے آخری سہارا اور روشنی کی آخری کرن ہوتے ہیں۔ لیکن تاریخ کی دیگر ستم ظریفیوں کی طرح یہ بھی ایک حقیقی ستم ظریفی ہے کہ ان اشخاص کو اپنی ہی قوموں کے ہاتھوں زہر کے پیالے بھی پینے پڑتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا خاندان والد اور والدہ دونوں جانب سے اصحاب علم وفضل کا خاندان ہے۔ آپ کے دادا مولانا محمد ہادیؒ دہلی کے مشہور علمی خانوادے کے معزز رکن تھے۔ جبکہ والدہ ماجدہ مدینہ کے مفتی اور مکّہ مکرمہ کے نامور محدّث حضرت شیخ محمد ظاہر وتریؒ کی بھانجی تھیں۔ آپ کے والد محترم کے نانا مولانا منورالدین اپنے زمانے کے مشاہیر وممتاز اساتذۂ علم ودرس اور اصحاب طریقت وسلوک میں سے تھے، شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ کے اجلّہ تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ نیز سلطنت مغلیہ کے آخری ''رکن المدرسین'' ہونے کا اعزاز بھی انہی کو حاصل ہے۔ والد کی طرف سے آپ کا سلسلۂ نسب یوں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ بن شیخ خیرالدین بن شیخ ہادیؒ بن شیخ محمد افضلؒ بن شیخ محمد محسنؒ۔ اِن میں سے زیادہ تر حضرات

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ ایمرسن کالج، ملتان، پاکستان
** لیکچرر، شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج، جہانیاں، پاکستان

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

کے محض نام معلوم ہیں، حالات معلوم نہیں۔ مولانا کے والدِ ماجد نے ان سب کے نام ومناقب معلوم کر لئے تھے اور اس کو ایک رسالہ کی شکل میں مرتب بھی کر لیا تھا۔ مگر اس کے شائع ہونے کی نوبت نہ آئی[1] اور یہ قیمتی صفحات دستبردِ زمانہ کی نظر ہو گئے۔ مولانا آزادؒ کے والدِ ماجد مولانا خیرالدینؒ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۷ھ میں پیدا ہوئے۔ تین چار سال کی عمر تھی کہ ان کے والد شیخ محمد ہادی انتقال کر گئے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد والدۂ محترمہ کے سایہ عاطفت سے بھی محروم ہو گئے اور یوں ان کی ساری ذمہ داری ان کے نانا شیخ منورالدین کے کاندھوں پر آن پڑی۔ جنہوں نے اپنی مرحومہ صاحبزادی کی اکلوتی نشانی اور خاندان کی علمی عظمت کے واحد وارث کی تعلیم وتربیت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ شیخ منورالدینؒ کا شمار اپنے وقت کے مشاہیر میں ہوتا تھا اور اسی وجہ سے ان کا تعلق بھی وقت کے مشہور علمائے کرام سے رہتا تھا۔ چنانچہ مولانا خیرالدین نے اپنے نانا کے علاوہ حضرت مفتی صدرالدین آزردہؒ سے بھی کسبِ فیض حاصل کیا۔ جنہیں مختلف علوم وفنون کے علاوہ عربی وفارسی ادب میں وہ مقام ومرتبہ حاصل تھا کہ پھر ان کے بعد کوئی ویسا عالم نہ ہوا۔ معقولات کی کتابیں مولانا رشیدالدینؒ سے پڑھیں اور حدیث کی تکمیل حجاز پہنچ کر شاہ محمد یعقوب دہلویؒ اور دیگر علمائے حجاز سے کی۔ غرض اٹھارہ برس کی مختصر عمر میں تکمیل علوم سے فارغ ہو چکے تھے۔ دوسرے علوم کے علاوہ طب بھی پڑھی بلکہ ڈاکٹری سے بھی شغف رہا۔ تکمیل کے بعد مروجہ دستور کے مطابق درس بھی شروع کر دیا۔

مولانا منورالدینؒ کے بمبئی میں ۱۸۵۹ء میں انتقال کر جانے کے بعد حجاز تشریف لے گئے۔ حجاز پہنچ کر تقریباً دس سال بعد یعنی ۱۸۷۱ء میں حجاز ہی میں شادی کی۔ یہ خاتون جو آپ کے عقد میں آئیں، آپ کے استاد شیخ محمد بن ظاہر وتریؒ کی بھانجی تھیں۔ ۱۸۷۲ء میں ترکی کا سفر کیا اور سلطان عبدالمجید سے ملاقات کی۔ تقریباً دو سال یہاں مقیم رہے۔ اس تمام عرصے میں آپ کتب خانوں کی سیر اور ترکی کے علمائے عظام کی صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے۔ اس کے بعد ایک سال ایشیائے کوچک کی سیاحت میں گزارا اور پھر متعلقین کی علالت کی وجہ سے مصر میں ایک سال مزید قیام کیا۔ اس طویل سفر کے بعد مکہ چلے آئے اور پھر ۱۸۷۶ء میں عراق تشریف لے گئے، تقریباً چھ سات ماہ کے قیام کے بعد ہندوستان آ گئے۔ یہاں تین سال تک ایک مسجد کی تعمیر میں مصروف رہنے کے بعد مکہ واپس چلے گئے۔ آخری مرتبہ ۱۸۹۸ء میں ہندوستان تشریف لائے۔

۱۸۹۹ء میں آپ کی اہلیہ اور مولانا آزادؒ کی والدۂ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ سے اتنا دلبرداشتہ ہوئے کہ فوراً مکہ جانے کا قصد کر لیا۔ لیکن معتقدین کے ہجوم میں ایسے مصروف ہوئے کہ دو سال بعد جانا ممکن ہو سکا، مگر جلد ہی لوٹ آئے۔ ۱۹۰۶ء میں آپ کے بڑے بیٹے اور مولانا آزادؒ کے بڑے بھائی غلام یٰسین آہؔ بھی مختصر علالت کے بعد عین عہدِ شباب میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ موصوف ذہانت وفطانت کے عجیب شاہکار تھے، اگر زندہ رہتے تو آزادؔ کو سب بھول جاتے۔ جواں سال بیٹے کی موت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس شدید صدمے نے وجود کو ہلا کر رکھ دیا اور بالآخر دو سال بعد ہی ۱۵/اگست میں ۷۷ سال کی عمر پانے کے بعد جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ کلکتہ میں اپنی اہلیہ اور فرزند کے قریب ہی مدفون ہیں۔ مولانا خیرالدینؒ نے اپنے پیچھے پانچ بچے چھوڑے۔ تین لڑکیاں اور دو لڑکے۔ لڑکیوں کے نام زینب، فاطمہ اور حنیفہ تھا، جبکہ لڑکوں کے نام ابونصر غلام یٰسین آہؔ اور مولانا ابوالکلام آزاد تھا۔ مولانا نے کئی کتب بھی تصنیف کیں۔ جن کے اسماء

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

مندرجہ ذیل ہیں۔

۱. نجم المبین لرجم الشیاطین
۲. الدرج الدرر البهیة فی ایمان ا لاباء و الامهات المصطفویه
۳. حفظ المتین عن نصوص الدین ۴. خیر الامصار مدینة الانصار
۵. اوراد خیوریة ۶. الستة الضروریة فی المعارف الخیوریة
۷. اسباب السرور لاصحاب الخیور ۸. الابصائرا لعشرة الجلیله (۲)

جن دنوں مولانا خیرالدینؒ حجاز میں مقیم تھے، انہی دنوں میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ اپنی پیدائش اور جائے پیدائش سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''یہ غریب الدیار عہد و نا آشنائے عصر و بیگانۂ خویش و نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا و خرابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے۔ ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستیِ عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمتِ حیات سے متہم ہوا۔۔۔ والد مرحوم نے تاریخی نام فیروز بخت رکھا۔۔۔ مولد و منشاءِ طفولیت وادی غیر ذی زرع عندِ بیت اللہ شرفاً و کرامۃً، محلّہ قدوہ متصل باب السلام''۔ (۳)

مالک رام (عبدالمالک) کے نزدیک اگست کی ۱۶، ۱۷ یا ۲۲ تاریخ مولانا کی تاریخ پیدائش ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے نزدیک ۱۶ یا ۱۷ اگست صحیح تاریخ ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کے نزدیک بھی اگست ہی میں ولادت ہوئی جبکہ قاضی عبدالغفار کے نزدیک ستمبر میں آپ کی ولادت ہوئی۔ حکومت ہند کے تحت چھپنے والی پروفیسر ہمایوں کبیر کی کتاب (Molana AbulKalam: A Memorial Volume) میں مطبوعہ تاریخ پیدائش ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء دی گئی ہے۔ جو کسی بھی صورت درست نہیں نامعلوم اس کا ماخذ کیا ہے۔ اکثریت ۱۶ یا ۱۷ اگست پر متفق ہے۔ لہٰذا اسی کو درست سمجھا جائے۔ (۴)

سات آٹھ برس کی عمر تھی کہ ۱۸۹۵ء میں والد کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے۔ کلکتے میں قیام کیا اور یہیں کے ہو کر رہے۔ اس لحاظ سے آپ کا مولد مکہ معظّمہ اور متوطن ہندوستان ہے۔ پیدائش کے وقت نام محی الدین رکھا گیا۔ تاریخی نام فیروز بخت تھا۔ آزاد تخلص کرتے تھے اور کنیت ابوالکلام تھی۔ مشہور ہوئے تو کنیت اور تخلص ساتھ رہے، نام سب بھول گئے۔ ابتدا میں اپنے نام کے ساتھ ''دہلوی'' لکھا کرتے تھے۔ چند لوگوں کو آپ کے دہلوی ہونے پر کلام تھا اس لئے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا تعلق جس خطۂ ارضی سے تھا ہندوستان اس کی خاک پاک کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اگر مولانا چاہتے تو اپنی نسبت اس طرف کر سکتے تھے، مگر مولانا نے ایسا نہیں کیا۔ اسی پر کیا موقوف یار لوگوں نے مولانا کے خاندان تک پر اعتراض کرنے پر کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔

مولانا کے نزدیک ان کے اجداد پشتوں سے دہلی میں رہتے تھے۔ اس لئے وہ ابتدا ہی سے اپنے آپ کو ''دہلوی'' لکھتے رہے۔ (۵) یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر مولانا آزادؒ نے اپنے آباؤ اجداد کی دیرینہ وطنیت کی بناء پر

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

اپنے نام کے ساتھ دہلویت کا لاحقہ لگا لیا تو اس انتساب سے انہیں کونسا شرف حاصل ہو گیا؟ لطف یہ کہ معترضین کو یہ اعتراض بھی پچاس ساٹھ سال گزر جانے کے بعد یاد آیا۔ تذکرہ کے آغاز ہی میں مولانا نے نسب کے بت کو جس طرح توڑا ہے۔ اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا کے نزدیک نسب اور متوطن انسان کے لئے مشرف ہونے کا ذریعہ نہیں۔ صرف تقویٰ ہی انسان کی فضیلت کا باعث ہو سکتا ہے۔

۱۸۹۲ء میں جب مولانا کی عمر پانچ سال تھی تو حرم بیت اللہ میں عرب کے ایک عالم شیخ عبداللہ نے آپ کی تعلیم کے باقاعدہ سلسلہ کے لئے آپ کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھائی۔ پھر کچھ عرصے تک آپ کے والدِ محترم مولانا خیرالدینؒ خود پڑھاتے رہے۔ جب فارسی اور عربی کی ابتدائی کتب پڑھ لیں تو دلّی کے بزرگ عالم مولانا محمد یعقوبؒ کو آپ کی تعلیم کے لئے مقرر کیا گیا۔ فارسی وفقہ آپ کو اپنے والد پڑھاتے رہے اور مولانا محمد یعقوبؒ نے عربی و منطق پڑھانی شروع کی، کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالحق خیرآبادیؒ کے ایک شاگرد مولوی نذیر احمد امیٹھوی نے "مطوّل"، "شمس بازغہ" اور "رشیدیہ" پڑھانی شروع کیں۔ مولانا نے باقاعدہ طالب علمی کو جو بھی زمانہ گزارا وہ اپنے گھر اور اپنے والد محترم کی خانقاہ ہی کے سایہ میں گزارا۔ چنانچہ آپ خود رقمطراز ہیں کہ:

> ''انہوں (مولانا کے والد مولانا خیرالدین) نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں۔ یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے ان سے تعلیم دلائیں''۔ (۶)

شمس العلماء مولانا سعادت حسنؒ سے بھی کچھ عرصہ شرفِ تلمذ رہا۔ والد محترم کے ہاں ایک خطاط حافظ بخاریؒ تھے کبھی کبھار ان سے بھی سبق لیتے۔ ان کے علاوہ مولانا محمد شاہ محدثؒ حضرت جلال بخاری کے خاندان سے تھے ان کے درس کا چرچا سنا تو ان سے بھی دو ماہ ترمذی شریف کا درس لیا۔ لکھنؤ کے مشہور طبیب سید باقر حسین جو اِن دنوں اتفاقاً ایک سال کے لئے کلکتے ٹھہرے ہوئے تھے، ان سے طب پڑھی، مگر طبیعت اس طرف آتی نہ تھی، اس لئے اسے ترک کر دینا پڑا۔

اسی عمر میں شاعری کا شوق ہوا اور شعر کہنے لگے۔ ابتدا میں اصلاح کے لئے امیر مینائی سے رجوع کیا، مگر اصلاح سے طبیعت مطمئن نہ ہوئی اور مشہور محدث، محقق اور شاعر شوق نیموی سے تعلق قائم کر لیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ وہ داغؔ یا امیر مینائی کی طرح شہرتِ عامہ نہیں رکھتے تھے، لیکن ان کے علم اور ان کی نظر میں مقابلتاً بہت زیادہ وسعت و تنوع تھا۔ (۷) گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ ابتدائی غزلیں ''ارمغان فرخ'' بمبئی اور ''خدنگ نظر'' لکھنو میں چھپیں۔ نیرنگِ عالم کے نام سے خود بھی ایک گلدستہ نکالا۔ اسی زمانے میں نثر نگاری کا آغاز ہوا۔ ابتدائی مضامین ''احسن الاخبار''، ''تحفہ احمدیہ'' کلکتہ اور ''مخزن'' لاہور میں شائع ہوتے رہے۔ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو کلکتے سے اپنا ماہنامہ رسالہ ''لسان الصدق'' نکالا جو ایک برس جاری رہا۔ (۸) اپنے بھائی ابونصرؔ آہ کے ہمراہ بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کرنا شروع کر دی۔ لیکن والدِ محترم اس معاملہ میں قدرے سخت واقع ہوئے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ دونوں میری موت کے بعد خانقاہی سلسلے کو جاری رکھیں۔ غالباً اِسی لئے ایک سال کے بعد ہی اس کوچہ کو بھی ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ دیا۔

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

مولانا کی خواہش تھی کہ انہیں کسی مکتب میں بٹھا دیا جائے، لیکن والد اس پر راضی نہ ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ انہیں گھر سے باہر قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ والد کے خادم خاص حافظ ولی اللہ کے ساتھ سال بھر میں محض دو بار شہر جانے کی اجازت تھی، عموماً پورا سال گھر ہی میں کٹتا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور والد سے لب کشائی کا حوصلہ نہ تھا۔ چنانچہ اس ماحول میں کتاب خوانی ہی ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے دل کو بہلایا جا سکتا تھا۔ دس سال کی عمر ہی میں کتب خوانی کا ایسا شوق ہوا کہ بقول شورش دس برس کی عمر میں ابوالکلام کتابوں کے اتنے رسیا ہو گئے کہ ناشتے کے جو پیسے ملتے انہیں جمع کرتے اور کوئی نہ کوئی کتاب خرید لاتے۔[۹] چونکہ سارا دن والد محترم اور دیگر اساتذہ سے درس لیتے رہتے تھے، اسلئے دن میں مطالعہ کا وقت نہ ملتا اور وہ رات کو موم بتی جلا کر پڑھتے۔ شورش کے مطابق اس سے ان کی صحت ضرور ہل گئی لیکن تمام جذبات کا مصرف مطالعہ و درس ہو گیا اور چھوٹی سی عمر ہی میں لکھنے پڑھنے والے انسان کی سنجیدگی پیدا ہو گئی۔[۱۰]

ابھی عمر کی دوسری دہائی میں تھے کہ اپنے بھائی ابونصر آہ اور آغا حشر کے ہمراہ عیسائی پادریوں سے مناظرہ شروع کر دیا۔ ان دنوں ۱۸۵۷ء کی استعماری فتح یابی کے بعد یہ مشنریاں مسلمانوں کو زور و شور سے عیسائی بنانے پر لگی ہوئی تھیں۔ کلکتہ اور بمبئی ان کی تبلیغ و دعوت کے اہم مراکز تھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

> ''چونکہ ہم تینوں کی طبیعت میں خطابت کا انداز تھا اور پادریوں کے طرز تخاطب کی کاٹ جانتے تھے۔ اس لئے ہم نے برس ڈیڑھ برس کے مناظروں میں پادریوں کو خاصا پریشان کیا۔ ہماری عادت ہو گئی تھی کہ جہاں پادری ہوتے وہاں پہنچ جاتے اور انہیں مختلف مباحث سے تنگ کرتے''۔[۱۱]

ان مناظروں سے تنگ آ کر پادریوں نے گورنر بمبئی سے ان کی شکایت کی کہ ان حضرات میں حکومت برطانیہ کے خلاف معاندانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مولانا کچھ عرصہ بعد ہی اس میدان سے دور ہونا شروع ہو گئے۔ خصوصاً والدِ ماجد کے انتقال پر ملال کے بعد تو یہ راستہ یک قلم منسوخ کر دیا اور کبھی اس طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

انہی دنوں فارسی کی ہمہ جہت تکمیل کا شوق چرایا۔ سب سے پہلے تو فصیح ایرانیوں سے ملاقات کی سبیل پیدا کی اور فارسی ادب کی دقیق کتب و لغات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان دنوں ایران کے ایک سیاح مرزا محمد حسین طبعی اتفاقاً ہندوستان تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان سے خوب استفادہ کیا اور فارسی ترکیبوں میں اصلاح لی۔ بمبئی میں مقیم ایک اور ایرانی استاد شیخ الرئیس سے بھی قریباً سال بھر تعلق تلمذ رہا۔ مولانا کی تحریر میں فارسی ترکیب و اشعار کی بہتات دراصل اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ خدا کی قدرت دیکھئے کے سولہ سترہ سال کی عمر میں جو کچھ ذہن نشین ہو گیا وہ آخر وقت تک برقرار رہا۔

مولانا کو اپنے بچپن میں جس طرح کا گرد و پیش میسر آیا اس میں اکثر بچوں کے بگڑنے کا امکان ہوتا ہے اور اس طرح کے ماحول میں کسی نوعمر میں سرے سے کسی باعظمت شخصیت کی بنیاد ہی نہیں بنتی۔ جب ارد گرد ہر طرف واہ !واہ! اور جی حضوریاں ہوتی ہوں، ہر آنے والا قدموں پر ہاتھ رکھ کر سلام کرے، ہر کوئی پیرزادہ کی بلائیں لینے والا ہو تو وہاں پیرزادہ صاحب کی شخصیت، تکبر، تن آسانی اور خوشامد پسندی کا مرقع بنتی چلی جاتی ہے۔ مگر مولانا کو اللہ تعالیٰ نے انوکھی طبیعت عطا فرمائی تھی۔

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

آپ بچپن ہی سے پیرزادگی، تن آسانی اورلہوولعب سے متنفراور کبیدہِ خاطر تھے۔مولانا نے خوداپنے وجدان کی راہنمائی سے اپنی شخصیت کی بنیادیں عظمت وعزیمت کے نقشے پر رکھیں۔اس تناظر میں لکھتے ہیں کہ:

''۔۔۔خلقت کا ہجوم واحترام آج کل سیاسی لیڈری کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے، وہ مجھے مذہبی عقیدت مندیوں کی شکل میں بغیر طلب وسعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔خاندانی پیشوائی و مشیخیت کی اس حالت میں نوعمر طبیعتوں کے لئے بڑی ہی آزمائش ہوتی ہے۔اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتداء ہی سے طبیعتیں برخود غلط ہوجاتی ہیں اورنسلی غروراور پیدائشی خود پرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے جوخاندانی امیرزادوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے۔۔۔لیکن جہاں تک اپنی حالت کا جائزہ لےسکتا ہوں، مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میری طبیعت کی قدرتی افتاد مجھے دوسری ہی طرف لے جارہی تھی۔''(۱۲)

مولانا کے اسی مکتوب کا ایک دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں:

'لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں،مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔۔۔کچھ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر وتفریح کے وسائل کی کمی ہو۔میرے چاروں طرف ان کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں اور کلکتہ جیسا ہنگامہِ گرم کن شہر تھا۔لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رخ ہی نہیں کرتی تھی۔''(۱۳)

اسی خاص طبیعت کی یہ کرشمہ سازیاں تھیں کہ آپ نے رسمی تعلیم کے نصاب کی کتب بھی دستورطالب علمی سے ہٹ کر خود اپنی ذہنی صلاحیتوں کی پرواز کے مطابق رفتار سے پڑھیں۔خود لکھتے ہیں کہ:

''تعلیم کی جورفتار عام طورر ہا کرتی ہے میرا معاملہ اس سے مختلف رہا۔۔۔اپنے بروقت استحضاراور اقتباسات سے نہ صرف طالب علموں بلکہ مولویوں کوبھی حیران کردیا کرتا تھا۔وہ مجھے بارہ برس کا لڑکا سمجھ کر بہت اڑتے تو میزان ومنشعب کے سوالات کرتے۔میں انہیں منطق کے قضیوں اوراصول کی تعریفوں میں لے جا کر ہکّا بکّا کردیتا''۔(۱۴)

یہ بات ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی تاریخ کے عجائبات میں سے ہے کہ ایک لڑکا پندرہ سال کی عمر میں درس نظامیہ کی تعلیم سے فارغ ہوکر تدریس کا آغاز بھی کر چکا تھا۔یہ نوجوان ابوالکلام کے سوا کون ہوسکتا ہے۔خود لکھتے ہیں:

''۱۹۰۳ء میں کہ عمر کا پندرہواں سال شروع ہوا تھا، میں درس نظامیہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔۔۔فاتحہِ فراغ کی مجلس ہی میں طلباء کا ایک حلقہ میرے سپرد کردیا گیا۔۔۔میں نے تکمیل فنون کے لئے طب شروع کردی تھی۔خود قانون پڑھتا اور طلباء کو مطوّل ، میر زاهد اور هدایه وغیرہ کا درس دیتا''۔(۱۵)

اگرچہ یہ سلسلہِ تدریس مولانا کی افتادطبع کے باعث مستقل جاری نہ رہ سکا مگراس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کتب درس نظامی کی ہر ہر بحث حافظے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگئی۔''تذکرہ''میں مولانا نے ان کتب سے جوطول طویل اقتباسات محض

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

اپنے حافظے کے زور پر نقل کئے ہیں، وہ اس کا بیّن ثبوت ہیں۔

یہی عمر ہے جب مولانا شک وتذبذب کے گرداب میں ایسے پھنسے کہ ایک طویل عرصے تک اس سے خلاصی ممکن نہ ہوسکی۔ مولانا کو ابتدا ہی سے غور وفکر اور تحقیق وتدقیق کی عادت تھی جو آہستہ آہستہ ان کی فطرتِ ثانیہ بنتی چلی گئی، جوں جوں مطالعہ وسیع ہوتا جارہا تھا توں توں مذہبی عقائد وافکار میں شکوک وشبہات کی راہ وسیع تر ہوتی جارہی تھی۔ طبیعت کا حال یہ تھا کہ ہر لمحہ وہ کسی نئی حالت کے لئے مضطرب وبے چین تھی۔ اگر چہ یہ اپنے آبائی مذہب سے بغاوت کی پہلی سیڑھی تھی مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ مذہب ہی سے بغاوت کر بیٹھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہوگیا تھا اور شک وشبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہئے اور علم وحقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے، جتنی سامنے آکھڑی ہوئی ہے، یہ چبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی۔ یہاں تک کے چند برسوں کے اندر عقائد وافکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گردوپیش نے چنی تھیں، بہ یک دفعہ متزلزل ہوگئیں، اور پھر وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں''۔ (۱۶)

ایک اور جگہ رقمطراز ہیں کہ:

''یہی زمانہ ہے جب پیرزادگی اور نسلی بزرگی کی زندگی بھی مجھے خود بخود چبھنے لگی اور معتقدوں اور مریدوں کی پرستاریوں سے طبیعت کو ایک گونہ توحش ہونے لگا۔ میں اس کی کوئی خاص وجہ اس وقت محسوس نہیں کرتا تھا۔ مگر طبیعت کا ایک قدرتی تقاضہ تھا، جو اِن باتوں کے خلاف لے جارہا تھا''۔ (۱۷)

یہ حالت کب تک رہی؟ اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''چودہ برس سے لے کر بائیس برس تک میرا یہی حال رہا گو ظاہری روپ ایک ایسے آدمی کا تھا جو مذہب کو عقل وعلم کے ساتھ چلانا چاہتا ہے، لیکن میرے اندر اعتقاد میں قطعی طور پر الحاد تھا، اور عمل میں فسق۔ یہی منزل میری آخری منزل تھی''۔ (۱۸)

مذکورہ بالا اقتباسات مولانا کی جن عبارات سے لئے گئے ہیں ان عبارات کو پڑھ کر بعض دفعہ کوئی سطحیت پرست وجلد باز یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید یہ تو مذہب کی حقیقت واہمیت پر کوئی حرف گیری ہے، حاشا وکلا ایسا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک انسان جب شعور کی عمر کو پہنچتا ہے تو اگر اس کی عقل کام کرتی ہے تو وہ ضرور اپنی معلومات کو اپنے مشاہدات سے تطبیق کے مرحلہ سے گزرتا ہے اور پھر وہ انسان جس نے آگے چل کر اپنے دور کے لوگوں کی فکری راہنمائی کے منصب پر فائز ہونا ہو، اس کے لئے قدرت خود اس کا سامان کرتی ہے جو پیغام اس نے کل کو اپنی قوم کے سامنے رکھنا ہے اسے خود اس پر شرح صدر کا درجہ حاصل ہو اور وہ اپنے دور کے معروضی حالات میں قوم کو واضح ودوٹوک راہنمائی فراہم کرسکے، تاکہ کل جب وہ قوم کے سامنے یہ دعویٰ رکھے کہ تمہاری بگڑی ہوئی صورتِ حال کے سنوارنے کا نسخہ یہ دین ہے تو اس میں اسے نہ کوئی جھجک ہو نہ ابہام۔ چنانچہ مولانا خود لکھتے ہیں کہ:

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

''میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے، جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں، اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو، میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیئے ہیں، میں جب پیاسا تھا تو میری تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہِ عام پر نہ تھا''۔ (۱۹)

یہی وجہ ہے کہ مولانا نے جب دعوت وتذکیر کے میدان میں قدم رکھا اور قوم کے سامنے اپنا پیغام رکھا تو دعوت پر کان لگانے والوں نے یہی محسوس کیا کہ یہ تو ہمارا ہی وہ سبق ہے جو ہم گردِ زمانہ کی بھول بھلیوں میں گم کر بیٹھے تھے۔ اس بات کو یوں بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ مفتیِ وقت اور مستفتی کے یقین واذعان کا جو فرق ہے، آخر وہ کیا ہے؟ یہی کہ مستفتی پیش آمدہ کسی بھی معروضی صورتحال کے شرعی حکم پر اس لئے یقین رکھتا ہے کہ مفتیِ وقت کا فتویٰ یہی ہے اور مفتیِ وقت جو حکم بتاتا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ اسلام کے اصول کی روشنی اسے یہی دکھا رہی ہے۔ حکم ایک ہے لیکن اس کے مان لینے کی کیفیت میں فرق ہے۔

ایک طویل عرصے تک مولانا شکوک وشبہات کے اس گرداب میں بھٹکتے رہے اور بالآخر قرآنِ مجید کی حقیقی تعلیمات نے مولانا کے ذہن میں اٹھنے والے تمام سوالات کے جوابات دیدیے۔ قرآن مجید کے اس مطالعہ نے مولانا کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب برپا کر دیا اور وہ ہر چیز کو منطقی وفلسفی نقطۂ نگاہ سے پرکھنے اور ان کے دلائل سے متاثر ہونے کی بجائے قرآن کی فطرتی اور سادہ تعلیمات ہی کو حجت تسلیم کرنے لگے۔ مگر شکوک وشبہات کی اس طویل صحبت کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ مولانا اپنے موروثی عقائد اور تقلیدی ایمان ہی پر قانع نہیں رہے، بلکہ انہوں نے اپنے لئے خود علم وفن کی نئی جہتیں اور راہیں نکالیں اور اسلامی تعلیمات کی روحانی اور ابدی سچائی کو اپنے اس طویل تحقیقی سفر کے نتیجے میں آخر کار پالیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہوا اس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف ونزاع کی انہی متعارض راہوں اور اوہام وخیالات کی انہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے، جو یقین اور اعتماد کی منزلِ مقصود تک چلی گئی ہے۔ اور اگر سکون وطمانیت کے سرچشمے کا سراغ مل سکتا ہے تو وہیں مل سکتا ہے۔ میں نے جو اعتقاد حقیقت کی جستجو میں کھو دیا تھا، وہ اس جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مل گیا۔ میری بیماری کی جو علّت تھی وہی بالآخر دارو ئے شفا بھی ثابت ہوئی۔۔۔ البتہ جو عقیدہ کھویا تھا، وہ تقلیدی تھا، اور جو عقیدہ پایا وہ تحقیقی تھا''۔ (۲۰)

انسان کے لئے مذہب کیوں ضروری ہے؟ اور کیا اس کے بغیر انسانیت کی تکمیل نہیں ہوسکتی؟ قرآنی تعلیمات کے مطالعہ کے بعد ان سوالات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ مولانا نے اس طویل مشاہدہ سے مذہب کے بارے میں جو نتیجہ اخذ کیا، وہ انہی کی زبانی سنئے:

''بہرحال زندگی کی ناگواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی تسکین ہی نہیں ہوتی، بلکہ ایجابی تسکین ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار (moral vlaues) کا یقین دلاتا ہے اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے۔ جسے انجام دینا چاہئے''۔ (۲۱)

ایک سوال یہ بھی تھا جس نے کفر والحاد تک پہنچا دیا تھا کہ کیا حقیقت میں خدا کا وجود ہے؟ اگر نہیں ہے تو اس کائناتِ ارضی وسماعی کا خالق کون ہے؟ یہ چاند، ستارے اور سورج کس کے اشاروں پر متحرک بہ عمل ہیں؟ آخر اس وسیع و عریض آسمان کو تھامنے والا اور اس طول وطویل زمین کا بچھانے والا کون ہے؟ آخر فطرت کی نیرنگیاں و بوقلمونیاں کس کے دستِ قدرت کا نتیجہ ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب تلاش کرنے کے لئے مذہب کا دامن تھامنا ضروری تھا۔ اور یہی ایک راستہ تھا جو انسان کو شکوک وشبہات کی دنیا سے نکال کر یقین واذعان کے عالم میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا رقمطراز ہیں:

''فطرتِ کائنات میں ایک مکمل مثال (pattern) کی نموداری ہے۔ ایسی مثال جو عظیم بھی ہے اور جمالی (Aesthtics) بھی۔ اسکی عظمت ہمیں مرعوب کرتی ہے۔ اس کا جمال ہم میں محویت پیدا کرتا ہے۔ پھر کیا ہم فرض کرلیں کہ فطرت کی یہ نمود بغیر کسی مدرک (Intelligent) قوت کے کام کر رہی ہے؟ ہم چاہتے ہیں کہ فرض کرلیں، مگر نہیں کر سکتے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایسا فرض کر لینا ہماری دماغی خودکشی ہوگی''۔ (۲۲)

اسی طرح ایک اور جگہ مولانا نے اس بحث کو انسان کے فطری تقاضوں سے مربوط کیا ہے۔ مولانا کے مطابق خدا کا اقرار انسان کے فطری تقاضے کا جواب ہے اس لئے اس کا جواب بھی اسی میں ہونا چاہئے۔ کیونکہ فطرت خود ہی سوال مہیا کرتی ہے اور پھر خود ہی اس کا جواب بھی سکھاتی ہے۔ مولانا کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' انہی سوالات کی صدائے بازگشت ہے۔ جگہ جگہ خدا کی ذات وصفات کے بارے میں مختلف اہم نکات موتی کی طرح جڑے نظر آتے ہیں اور چونکہ مولانا خود ان شاہراہوں سے گزر چکے ہیں، جن کی ابتدا شک وتذبذب سے شروع ہو کر انتہا کفر والحاد پر ہوتی ہے اس لئے انہوں نے تفسیر میں ان سوالات کے جوابات کا خصوصی التزام کیا ہے۔ ایک مرتبہ کسی نے مجلس میں مولانا سے دریافت کیا کہ حضرت! آپ انکار والحاد کے بیاباں سے کیونکر نکلے؟ مسکرائے اور فرمایا:

''اس کا جواب تو ترجمان القرآن کی دونوں جلدیں ہیں۔۔۔ سورۂ فاتحہ کے مباحث بتاتے ہیں کہ دماغی سفر کی وادیاں کتنی سنگلاخ تھیں، یہ ایک دور دراز کا سفر تھا جو میں نے بفضل تعالیٰ عمر کی دوسری دہائی کے آخری ثلث میں طے کرلیا، ورنہ اس قسم کی منزلیں کئی ہی دہائیوں میں طے نہیں ہوتیں۔ لوگ قرآن کے مطالعے سے سیرت کی طرف آتے ہیں میں سیرت کے مطالعے سے قرآن کی طرف لوٹا تو میرے دل ودماغ کا ہر کانٹا صاف ہوگیا اور میں بفضل تعالیٰ انکار والحاد کے بیابان سے نکل آیا''۔ (۲۳)

بنیادی طور پر اعتقاد ومسلک کے لحاظ سے مولانا کی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلا دور وہ ہے جس میں مولانا پیدائشی پیرزادہ تھے، جسے اسلام کی نعمت ورثے میں ملتی ہے۔ دوسرا دور وہ ہے جس میں ان کے ذہن کو شک و اضطراب نے جھنجوڑ کر رکھ دیا اور وہ ہر چیز کو عقل کی بنیاد پر پرکھنے لگے۔ اس کے نتیجے میں اعتقاد کی وہ تمام عمارت ڈھانی پڑی جو بچپن کی تعلیم وتربیت نے قائم کی تھی (اس کا تفصیلی ذکر گذشتہ سطور میں گزر چکا ہے)۔ تیسرا دور وہ ہے جس میں وہ اس نتیجے

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

پر پہنچے کہ مذہب کی پیچیدگیاں اوراس کے مسائل صرف عقل وخرد سے ہی نہیں حل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اس کے لئے پاکیزہ دماغ اور بے میل و بے لوث جذبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ چوتھا دور وہ ہے جس میں مولانا اس نتیجے پر پہنچے کہ قرآن تمام گمشدہ سچائیوں کا احیاء ہے، اس کی تعلیمات کل انسانیت کے لئے ہے۔ اور یہ انسانیت کو ایک خدا کی چوکھٹ پر لانے کی دعوت دیتا ہے۔

مولانا کو عقائد میں سلف سے تجاوز گوارانہ تھا اوراس معاملے میں وہ بہت معتدل تھے۔ نہ بہت زیادہ تنگ دلی وتنگ نظری اور نہ ہی اپنے نام کے مصداق بالکل آزاد۔ مولانا خود اپنے عقیدہ کی تشریح جن الفاظ میں کرتے ہیں اس سے ان کے اعتقادی میلان کا پتہ چلتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں اعتقاد توحید ورسالت اور عمل صالحہ کو نجات کے لئے کافی سمجھتا ہوں۔ اس کے سوا مجھے اور کچھ معلوم نہیں، قرآن کریم مسلمانوں کا حقیقی امام ہے۔ **وکل شئی احصیناہ فی امام مبین**''۔ (۲۴)

جہاں تک عبادات کا تعلق ہے تو اس باب میں وہ صوم وصلوۃ کے پابند اور فرائض وواجبات کا باقاعدہ اہتمام کرتے تھے۔ مگر اس سلسلے کو خدا اور بندے کا معاملہ قرار دیتے تھے۔ اوراس ذیل میں شخصی وعوامی سند کے ہرگز قائل نہ تھے۔ نماز میں انہماک کا اندازہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے اس قول سے ہوتا ہے کہ:

''میں نے اپنی زندگی میں دو ہی انسانوں کی نمازیں دیکھی ہیں۔ جن سے مجھے پتہ چلا کہ نماز کسے کہتے ہیں۔ ایک ابوالکلامؒ کی اور دوسری مولانا محمد الیاسؒ کی''۔ (۲۵)

چند شر پسند عناصر نے مولانا پر کفر کا فتویٰ داغ دیا اور الزام لگایا کہ وہ نماز کی پابندی نہیں کرتے۔ چنانچہ اس کا ذکر سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے جب مولانا سے کیا تو مولانا نے فرمایا:

''شاہ صاحب جب تک انہیں میری سیاست سے اختلاف ہے اس وقت تک میرا اسلام ان کے ہاں مشکوک ہے اور اگر میں ان کی سیاست کا ہو جاؤں تو پھر اسلام سے میرا لہو لعب بھی عین اسلام ہوگا۔ انہیں اسلام کی آڑ میں اپنی سیاست سے دلچسپی ہے''۔ (۲۶)

مولانا کے والد کے ایک مرید مولوی آفتاب الدین تھے۔ جو تمام عمر سروے آفس کلکتہ میں ملازم رہے، سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے جا ملتا تھا۔ آپ کا خاندان بغداد سے ہجرت کر کے ہندوستان آن بس تھا۔ اللہ نے ایک بیٹے اور پانچ بیٹیوں سے نواز رکھا تھا۔ ان میں سے ایک کی شادی ابونصر آہؔ سے ہوئی۔ جبکہ سب سے چھوٹی بیٹی زلیخا مولانا آزاد کے ساتھ بیاہی گئیں۔ بوقت شادی مولانا کی عمر بارہ سال اور زلیخا بیگم کی عمر نو سال تھی۔ مولانا کی ہمشیرہ آرزو بیگم کی روایت کے مطابق مولانا اتنی سی بات پر روپڑے کہ انہیں زنان خانے میں لے جایا جا رہا ہے۔ مولانا کا سسرال قریب میں ہی واقع تھا۔ جس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ مولانا کے سیاسی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اکثر وقت قید و بند کی صعوبتوں میں گزرتا تھا، جس کے باعث گھر خالی رہتا۔ ان حالات میں انہی لوگوں سے گھر میں چہل پہل قائم رہتی۔ زلیخا بیگم کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے شورش کاشمیریؔ لکھتے ہیں:

''زلیخا بیگم نے اپنی تمام زندگی ایک آئیڈیل بیوی کی طرح گزاری۔ مولانا کے فقر وفاقہ میں شریک رہیں۔ اور

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

خوشحالی کا دور شاذ ہی دیکھا۔ مولانا گھر میں نہ ہوتے، فون آتے تو ریسور نہ اٹھاتیں''۔(۲۷)

مولانا کے دل میں اپنی اہلیہ کے لئے بے انتہا احترام اور محبت تھی۔ وہ تمام زندگی مولانا کے ہمرکاب رہیں، ان کی سیاسی زندگی اور پے در پے قید و بند کی طویل غیر حاضریوں میں بھی ہمیشہ صبر و شکر سے کام لیتی رہیں۔ اگر مولانا گھر ہوتے تو ان کے لئے کھانا اپنے ہاتھوں سے تیار کرتیں اور ان کی خدمت میں کوئی کمی نہ آنے دیتیں۔ جن دنوں مولانا اپنی شہرۂ آفاق تفسیر'' ترجمان القرآن'' لکھ رہے تھے، عام طور پر معمول یہ تھا کہ رات کے دو بجے اٹھ بیٹھتے اور لکھنا شروع کر دیتے، گرمی کا موسم ہوتا تو زلیخا پنکھا جھلتی اور مولانا مصروف کار رہتے، رات بھر جاگنے سے آنکھوں میں سرخ ڈورے پیدا ہو جاتے۔ ایک بار کسی نے آنکھیں سرخ ہونے کی وجہ دریافت کی تو انتہائی طمطراق سے بولیں:

''رات بھر مولانا کو پنکھا جھلتی رہی ہوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں، تفسیر لکھیں اور میں آرام سے سوتی رہوں''۔(۲۸)

مولانا خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقاید میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار''۔(۲۹)

زلیخا بیگم سے شادی کا ایک مثبت اور دوررس نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا تھا کہ مولانا میں اس ازدواجی تعلق نے قدرتی طور پر ایک ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا۔ اگر ان حالات میں مولانا کے اندر یہ تبدیلی پیدا نہ ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ آج مولانا کے بارے میں ہمارا زاویہ نظر قدرے مختلف ہوتا۔ اس بات کا اعتراف مولانا نے خود بھی کیا ہے۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''ازدواجی زندگی تین چیزیں پیدا کرتی ہیں۔ سکون، مودّت، رحمت۔ سکون عربی میں ٹھہراؤ اور جماؤ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کی طبیعت میں ایسا ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا ہو جائے کہ زندگی کی بے چینیاں اور پریشانیاں اسے ہلا نہ سکیں''۔(۳۰)

تحریک آزادی کے سلسلے میں مولانا کی پے در پے گرفتاریوں نے ان کی صحت کو بری طرح متاثر کیا۔ جوں جوں آزادی کی تحریک زور پکڑتی جارہی تھیں، توں توں مولانا کی مصروفیت بھی بڑھتی جارہی تھی۔ ان دگرگوں حالات میں گھریلو مصروفیات پسِ پردہ چلی گئی تھیں اور مولانا اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے پارہے تھے۔

یقیناً مولانا کی طویل جدائی ہی وہ واحد وجہ تھی جس نے زلیخا بیگم کو موت کے ہم آغوش کر دیا۔ ڈاکٹروں سے ایک ہی بات بار بار کہتی تھیں کہ خدارا ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو۔ لیکن دوسری جانب حکومت برطانیہ نے اس موقع پر جس طرح کی قساوتِ قلبی کا ثبوت دیا اور انسانیت کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کی وہ اس کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔ اس نازک موقع پر بھی مولانا کو اپنی رفیقِ حیات سے نہیں ملنے دیا گیا۔ بالآخر ۱۹/اپریل ۱۹۴۳ء کو ۳۶ برس کی طویل رفاقت کے بعد پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں مولانا کے رفیق کار مولانا عبدالرزاق ملیح آبادیؒ کو طلب فرمایا۔ مولانا ملیح آبادیؒ نے کبھی اچٹتی نظر سے بھی انہیں نہ دیکھا تھا۔ قدرے ہچکچائے، مگر اصرار بڑھا تو حاضر

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

ہوگئے۔فرمانے لگیں:

''آپ میرے بھائی ہیں۔میں آپ کی ہمیشہ شکرگزار رہی ہوں۔مولانا کا دیدار ممکن نہیں۔مولانا سے کہنا کہ آپ ہی کے نام پر مر رہی ہوں۔مگر میرے چلے جانے کا غم نہ کرنا''۔ہاتھ لرز رہے تھے۔کہنے لگیں کہ مولانا کے لئے تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہچکی آئی اور رخصت ہوگئیں''۔(۳۱)

مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز کب اور کس رسالے سے ہوا؟اس بارے میں کوئی حتمی اور دوٹوک رائے تو قائم نہیں کی جاسکتی،اور نہ ہی ان رسائل و جرائد کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جن میں مولانا نے لکھا،تاہم تاریخی شواہد کی روشنی میں جو فہرست مرتب کی گئی ہے اس کی روشنی میں مندرجہ ذیل رسائل و جرائد سے مولانا وابستہ رہے۔

☆ نیرنگ عالم (یہ ماہنامہ کلکتہ سے ۱۸۹۹ء میں جاری ہوا)۔

☆ المصباح (یہ ہفتہ وار جریدہ تھا جو کانپور سے جاری ہوا)۔

☆ خدنگِ نظر (یہ ماہنامہ ۱۹۰۲ء-۱۹۰۰ء لکھنو سے نکلتا رہا)۔

☆ ایڈورڈ گزٹ (یہ رسالہ مولانا کی ادارت میں ۱۹۰۳ء میں شہجہانپور سے جاری ہوا)۔

☆ احسن الاخبار (یہ ہفتہ وار اخبار مولانا کی ادارت میں کلکتہ سے ۱۹۰۲ء میں جاری ہوا)۔

☆ تحفۂ احمدیہ (یہ ۱۹۰۰ء-۱۸۹۹ء کلکتہ سے نکلتا رہا)۔

☆ لسان الصدق (یہ ماہنامہ ۱۹۰۵ء-۱۹۰۳ء پوری آب وتاب سے نکلتا رہا)۔

☆ الندوہ (مولانا نے علامہ شبلیؒ کی دعوت پر اس ماہنامہ کی ادارت قبول کی اور ۱۹۰۶ء-۱۹۰۵ء اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے)۔

☆ وکیل (یہ سہ روزہ اخبار امرتسر سے مولانا کی ادارت میں ۱۹۰۷ء-۱۹۰۵ء تک نکلتا رہا)۔

☆ دارالسلطنت (یہ ہفتہ وار اخبار کلکتہ سے مولانا کی ادارت میں ۱۹۰۷ء میں جاری ہوا)۔

☆ الہلال (اس ہفتہ وار اخبار کا اجراء ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے ہوا)۔

☆ البلاغ (الہلال پر حکومتی پابندی کے نتیجے میں اس کا آغاز ۱۹۱۵ء میں کیا گیا)۔

☆ اقدام (یہ اخبار ۱۹۱۵ء میں جاری ہوا)۔

☆ پیغام (اس کا آغاز ۱۹۱۲ء میں تحریک ترک موالات کے سلسلے میں ہوا)۔

☆ الجامعہ (یہ پندرہ روزہ عربی مجلّہ تھا جو ۱۹۲۴ء-۱۹۲۳ء نکلتا رہا)۔

☆ الہلال (۱۹۲۷ء میں الہلال کو دوبارہ جاری کیا جو کچھ عرصے جاری رہا۔اور یہ مولانا کی صحافتی زندگی کا نقطۂ اختتام تھا)۔

مولانا کی صحافت کا یہ زمانہ جو آٹھ سال سے زائد نہیں قلم کی ابتدائی مشق کا دور ہے۔یا پھر اخبار نویسی کے آغاز سفر میں شوق کی قدم فرمائیوں کا تذکرہ ہے۔مولانا کی اصل شخصیت ''الہلال'' سے طلوع ہوئی ''ترجمان القرآن'' سے نصف النہار پر آ گئی اور ملکی

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

سیاست نے اسے ایک عظیم قیادت بنا دیا۔

۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو مولانا نے ''الہلال'' کا اجراء کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورے ہندوستان کو اپنے سحر میں جگڑ لیا۔ ''الہلال'' کے اجراء سے پہلے مولانا کی کوئی خاص پہچان نہیں تھی اور نا ہی وہ ہندوستان کے صفِ اول کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ ''الہلال'' نے مولانا کو امام الہند بنا دیا، اور ان کی آواز اور دعوت پر پورا ہندوستان ہمہ تن گوش ہو گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے الفاظ ہیں کہ ''ہم اپنا سبق بھول چکے تھے، الہلال نے ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلایا''۔ شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں:

''۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ الہلال سے بڑا ہفتہ وار آج ۶۱، برس بعد بھی اردو صحافت پیش نہیں کر سکی نہ اتنا بڑا مجلّہ، نہ اتنا بڑا ایڈیٹر اور نہ اتنا بڑا ذہنی، علمی، تاریخی فکری اور جذباتی صحیفہ۔ لوگ پڑھتے تو سر دھنتے اور دیکھتے تو مست ہوتے تھے۔ اس کی خوبیاں اس کے ساتھ ختم ہو گئیں، وہ پرچہ نہیں ایک عہد تھا، ایک تاریخ تھا، ایک انجمن تھا ایک تحریک اور ایک اکادمی تھا''۔ (۳۲)

''الہلال'' کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

۱۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو قرآن ہی ہے۔ اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔

۲۔ ہم نے تو اپنے پولیٹیکل (سیاسی) خیالات مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے کیونکر علیحدہ کر دیں؟ ہمارے عقیدہ میں ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفرِ صریح ہے اور پالیٹکس بھی اس میں داخل ہے۔

۳۔ قرآن سامنے ہوتا تو نہ گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا نہ ہندوؤں کے اقتدار کی ضرورت پیش آتی، اسی سے سب کچھ سیکھتے جس کی بدولت تمام دنیا کو سب کچھ سکھایا ہے۔

۴۔ اسلام انسان کے لئے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا ہے۔

۵۔ الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ خواہ تعلیمی مسائل ہوں خواہ تمدنی یا سیاسی ہوں۔ خواہ اور کچھ ہو۔ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔

۶۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹکل پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کیلئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں داخل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلنے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ ہم کسی کے ساتھ نہیں صرف خدا کے ساتھ ہیں۔

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

۷۔ الہلال کی پالیٹکس میں یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بے جا اعتماد رکھئے نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہوئیے۔صرف اس راہ پر چلئے جو اسلام کی بتلائی ہوئی صراط المستقیم ہے۔(۳۳)

مولانا نے ''الہلال'' انتہائی غور وخوض اور سوچ و بچار کے بعد جاری کیا تھا۔مولانا یہ فیصلہ تو اس کے اجراء سے پہلے ہی کر چکے تھے کہ ہندوستان کو فرنگی تسلط سے آزاد ہونا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بخوبی جانتے تھے کہ اس فیصلہ پر عملی قدم اٹھانا بچوں کا کھیل نہیں اور یہ وہ راستہ ہے جس کے چپے چپے پر کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ہندوستان میں انفرادیت سے ہٹ کر اجتماعی بنیادوں پر جذبہ وطنیت پیدا کر کے مذہب وقوم کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے تو آزادی کا حصول کسی صورت ممکن نہیں۔

''الہلال'' نے جب اپنا سفر شروع کیا تو اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔سب سے بڑی رکاوٹ تو یقیناً انگریز حکومت تھی جو اس اخبار کے اغراض ومقاصد کو کسی صورت قبول نہیں کر سکتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو اپنے ہندوستانی حاسدین کی حاسدانہ شرارتوں کا بھی سامنا تھا، جو محض ان کے علم وتبحر سے سراسیمہ تھے۔ذرا یہ خط ملاحظہ کیجئے جو لکھنؤ سے ان کے ایک حاسد نے بھیجا۔

''او فرعون وقت اونمرود زمان !او ابلیس ابن ابلیس !تم سمجھتے ہو کہ الہلال نکال کر اور اس میں قرآن کی آیتیں بھر کر قوم کے مصلح بن جاؤ گے؟ یہ منہ مسور کی دال! پہلے ذرا یہ تو بتلائیے کہ آپ نے اب تک کسی کالج تو خیر کسی انگریزی کے اسکول میں ابجد خوانی بھی کی ہے؟ تم کو شرم نہیں آتی کہ قوم کے ان مسلم اور واجب الاحترام سچے لیڈروں کو گالیاں دیتے ہو، جو تمہارے جیسے قل اعوذیے اور قرآن خوان ملاں خرید کر تقسیم کر سکتے ہیں؟ بدمعاش! بے حیا! شیطان! آخر تو نے اپنے تئیں سمجھا کیا ہے؟''(۳۴)

اس خط میں مولانا کو جن القابات سے مخاطب کیا گیا ہے، وہ اس حاسد کی اسفلیت اور مخصوص عصبیت کی غماز ہے۔لیکن دوسری طرف مولانا نے جس تحمل اور حوصلے کا مظاہرہ کیا، وہ مولانا کے داعی حق ہونے کی روشن مثال ہے، جو دلچسپی سے خالی نہیں۔مولانا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے نعائم خصوصیہ میں سے ایک بہت بڑا فضل اس عاجز پر یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ میرے نفس خبیث کی تنبیہ وتادیب کیلئے کوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کر دیتا ہے۔اس قسم کے خطوط کا نہایت شکر گزار ہوں کہ یہ مجھ کو کبر و غرور کے استیلا سے محفوظ رکھتے ہیں، اور میری اصلیت وحقیقت مجھ کو یاد دلا کر غفلت وسرکشی سے ہشیار کر دیتے ہیں''۔(۳۵)

مولانا نے خود ایک جگہ ''الہلال'' کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''۔۔یہ امر واقعہ ہے کہ الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔الہلال نے مسلمانوں کو مقدار کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی، اور بے خوف ہو کر

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔۔۔میں بتلانا چاہتا ہوں کہ ''الہلال'' تمام تر'' آزادی یا موت'' کی دعوت تھی۔اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق اس نے جس مسلک بحث ونظر کی بنیاد ڈالی،اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے،صرف اس قدر اشارہ کروں گا کہ ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی جو روح پیدا کر رہے،الہلال اس کام سے ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا تھا۔'' (۳۶)

خطابت کے میدان میں مولانا کا سفر تحریک خلافت سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔اس کا آغاز کیسے ہوا؟اس کا ذکر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ان کی سوانح میں کیا ہے۔چنانچہ لکھتے:

''مولانا آزاد نے اوائل عمر ہی میں علم ومطالعہ کی وادیاں قطع کر لی تھیں۔وہ موروثی خطیب ہے۔ان کے والد ایک بہت بڑے واعظ تھے۔مولانا عمر کے ابتدائی دور میں تھے کہ والد نے منبر ومحراب پر کھڑا کر دیا اور وہ تقریر کرنے لگے''۔ (۳۷)

مولانا کی حقیقی بہن فاطمہ بیگم کے مطابق انہیں خطابت کا شوق بچپن سے تھا۔وہ (مولانا) گھر میں کسی اونچی چیز پر کھڑے ہوجاتے تھے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم لوگ تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں۔ (۳۸)

مولانا نے اپنی زندگی کی سب سے پہلی تقریر ۱۹۰۱ء میں کی جب ان کی عمر محض ۱۲ سال کے قریب تھی۔قریب چار سال بعد یعنی ۱۹۰۴ء میں باقاعدہ مجمعِ عام میں اپنی پہلی تقریر انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس کے موقع پر کی۔اس اجلاس میں مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی نعمانی جیسی شخصیات بھی شریک تھیں۔جب مولانا کی باری آئی تو سب نے دیکھا کہ ایک ننھا منا نوعمر بچہ سیاہ شیروانی اور عربی عبا میں ملبوس سٹیج پر آیا اور اپنی آواز کی دلکشی، زبان کی سادگی اور خطابت کے زیر وبم سے تمام مجلس کو تہہ وبالا کر ڈالا۔شبلی حیران وپریشان، حالی ہکا بکا اور ڈپٹی نذیر احمد مبہوط ومخبوط۔بعد از تقریر ڈپٹی صاحب نے فرمایا تقریر خوب رٹی ہوئی ہے۔مولانا نے ان کے ان ریمارکس پر فرمایا۔ڈپٹی صاحب جو عنوان تجویز فرمائیں اس اجلاس میں یا اس سے اگلے اجلاس میں اسی موضوع پر تقریر کروں گا۔ڈپٹی صاحب نے موضوع تجویز کیا،مولانا نے تقریر کی اور حاضرینِ مجلس عش عش کر اٹھے۔اسی موقع پر خواجہ حالی سے ملاقات ہوئی۔جنہیں شروع میں یقین نہ آیا کہ ''لسان الصدق'' کے ایڈیٹر یہی ہیں۔اسی طرح مولانا شبلی سے جب بمبئی میں ملاقات ہوئی تو وہ بھی ابتداً انہیں ابوالکلام ماننے میں متامل رہے۔مگر پھر اتنے گرویدہ ہوئے کہ رسالہ ''الندوہ'' کی ادارت سپرد کری۔ (۳۹)

۱۹۱۲ء میں مصر کے نامور ادیب اور مفکر علامہ رشید رضا مصری ہندوستان تشریف لائے۔ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علامہ شبلی نے انہیں ندوۃ العلماء کی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔چنانچہ ۱۲/اپریل کو علامہ رشید رضا مصری اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے ندوہ تشریف لائے اور کانفرنس کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔اس کانفرنس کی آخری تقریر علامہ مصری نے عربی زبان میں پیش کی اس موقع پر اگرچہ عربی دان طبقے کا وسیع حلقہ موجود تھا۔لیکن سامعین کا

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

اکثر حصہ تقریر سمجھنے سے قاصر تھا۔ کامل ڈھائی گھنٹے کی تقریر کے بعد جب علامہ مصری اپنے سامعین کو مسحور کر کے سٹیج سے اترے تو مولانا آزاد، علامہ شبلی کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: اگر تقریر کا اردو میں ترجمہ ہو جاتا تو افادیت عام ہو جاتی۔ اولاً تو علامہ اس جراتِ رندانہ پر حیران ہو گئے کہ مصر کے سب سے بڑے ادیب وخطیب کی تقریر کا ترجمہ اور وہ بھی بلا توقف، یہ کیونکر ہوگا؟ مگر پھر اصرار پر اجازت دیدی۔ چنانچہ مولانا سٹیج پر گئے اور علامہ مصری کی تقریر من وعن اردو میں بیان کر دی اور اپنے اعجازِ بیان اور جوش روانی سے تمام مجمع اپنے نام کر لیا۔ کئی گھنٹوں کی تقریر کے بعد جب مولانا سٹیج سے نیچے اترے تو علامہ شبلی نے فرطِ انبساط میں مولانا کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے مولانا آزاد کے نام اپنے ایک خط میں اس تقریر کی بابت لکھا ہے:

''جلسۂ ندوہ میں آپ کی تقریر کا عالم یادِ شوق میں اب تک تازہ ہے۔ آپ کے کھڑے ہونے کا انداز، تقریر کا جوش، آواز کا لہجہ گویا دیکھ رہا ہوں، سن رہا ہوں۔ حالانکہ تیس برس گزر گئے''۔ (۴۰)

سید سلیمان ندوی جو اس جلسے میں موجود تھے، اس واقعہ کی شہادت میں یوں رطب اللسان ہیں:

''ندوہ کا اجلاس لکھنو ۱۹۱۲ء میں سید رشید رضا مصری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سید صاحب نے ڈھائی گھنٹے تک عربی میں ایک نہایت دلآویز وفصیح تقریر فرمائی۔ سماں بندھ گیا۔ اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی قادرالکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے۔ وہ سید رشید رضا مصری کی عربی تقریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوتے تو بجائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم برپا کر دیتے تھے۔ (۴۱)

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو مولانا کی خطابتی زندگی تین ادوار میں منقسم ہے۔ سب سے پہلا دور وہ ہے جب مولانا محض قرآن وحدیث کے خطیب تھے۔ گویا یہ خطابت کی ابتداء تھی جو نوعمری کے تمام عرصہ میں رہی۔ اس دور میں عموماً اپنے والد کی روش پر وہ وعظ کہتے تھے۔ مگر تحریکِ خلافت سے ان کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا اور وہ عوامی خطیب بن گئے۔ اس دور میں ان کی تقاریر جوش وجذبہ، ہمت ولولہ اور دردِ ملت سے معمور ہوتیں۔ یہ تقاریر گاہے بگاہے ان کے جریدے ''الہلال'' میں بھی چھپتی رہتی تھیں۔ (۴۲) تیسرا دور وہ ہے جب مولانا میدانِ سیاست کے شہسوار اور ہندوستان کے صف اول کے راہنماؤں میں شمار ہونے لگے تھے۔ اس دور میں اکثر وہ کانگریس کی صدارت کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ اگرچہ جوش وولولہ اور شعلہ بیانی اس دور میں بھی قائم رہی مگر اب اس میں اعتدال آ گیا تھا۔ اور وہ سحر بیانی سے زیادہ ہندوستان اور اس کی عوام کے مفادات پر زور دینے لگے تھے۔ اسی دور کی ایک یادگار اور نادر تقریر جو مولانا نے ۱۹۴۸ء میں جامع مسجد شاہجہان دہلی میں فرمائی تھی۔

مولانا کی ادبی زندگی کو بھی تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۶ء تک کا ہے، جب وہ اخباروں اور رسالوں میں لکھتے رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے بڑے بڑے ادیبوں اور انشاء پردازوں کی موجودگی میں اپنے قلم کا سکہ جما لیا (تذکرہ اسی دور کی یادگار ہے)۔ دوسرا دور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک کا ہے جس میں وہ زیادہ تر قرآن مجید کے

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

ترجمہ وتفسیر کے کام میں مصروف رہے۔اس دور میں باوجود سیاسی جھمیلوں کے ان کا دماغ زیادہ تر قرآنی علوم ومعارف میں ڈوبا رہا(ترجمان القرآن اسی دور کی یادگار ہے)۔تیسرا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک کا ہے۔اس دور میں مختلف عوامل نے مولانا کی طبیعت اوران کے ادبی اسلوب پر گہرے اثرات مرتب کئے۔عمر، تجربہ اورقومی ذمہ داریوں کے بوجھ نے ان کے مزاج میں کافی اعتدال پیدا کردیا۔

درحقیقت مولانا ابوالکلام آزادؒ سیاست کے آدمی نہ تھے بلکہ اس پرخار وادی میں وہ اتفاقاً آ نکلے تھے۔اس کا اظہار بارہا مولانا نے خود بھی کیا ہے۔مولانا کی علمیت اور ذہنیت کی اصل جولانگاہ علم وادب تھا اور اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ برصغیر پاک وہند میں اپنی نوعیت کے منفرد اور یگانہ ادیب وانشاء پرداز تھے۔اگر قوم وملت کا دردوغم اور وطن کی آزادی کا عزم انہیں ہندوستان کے سیاسی دھارے میں نہ لے آتا تو وہ آج ہندوستان کے سب سے بڑے ادیب ہوتے۔اپنی طبیعت کی اس افتاد کا تذکرہ مولانا نے خود ایک جگہ کیا ہے۔چنانچہ لکھتے ہیں کہ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا۔ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔(۴۳) اس کے باوجود اردو ادب پر مولانا کے جو احسانات ہیں انہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ان کے ادبی شہہ پاروں کو اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔اس باب میں وہ اپنے فن کے مجتہد تھے اوران کا یہ فن انہی سے شروع ہوکر انہی پر ختم ہوگیا۔مولانا کے چند ادبی ونثری نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔جن سے ان کا ادبی رجحان اور خدمات کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ آہ! کاش مجھے وہ صور قیام قیامت ملتا، جس کو میں لیکر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا، اسکی ایک صدائے رعد آسائے شکن سے۔سرگشتگانِ خواب ذلت ورسوائی کو بیدار کرتا۔اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیونکہ بہت سو چکے ،اور بیدار ہو! کیونکہ اب تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو پر اسکی نہیں سنتے، جو تمہیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے!(۴۴)

۲۔ میں وہ صور کہاں سے لاؤں، جسکی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کردے؟ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں۔جن کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خواب موت آور ہشیار ہوجائیں؟ کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو دردِ ملت میں خونباری کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل، جن کو زوالِ ملت کے زخموں پر ناز ہے؟ کہاں ہیں وہ جگر، جو آتشِ غیرتِ وحمیت کی سوزش کے لذت آشنا ہیں؟(۴۵)

۳۔ اس بارگاہِ سودوزیاں کی کوئی عشرت نہیں جو کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔یہاں زلال صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا جو دردِ کدورت اپنی تہہ میں نہ رکھتا ہو۔بادہ کیمیابی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارنا کامی لگا رہا اور خندۂ بہار کے پیچھے گریۂ خزاں کا شیون برپا رہا۔(۴۶)

۴۔ جب لوگ کامجوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے، تو ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔انہوں نے پھول چن لئے اور کانٹیں چھوڑ دیئے۔ہم نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دیے۔(۴۷)

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

۵۔ تم بارش کے وجود سے انکار نہیں کرتے، لیکن منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے، تو اقرار کریں۔ لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بوسونگھ لینے کا عادی ہوں اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو۔ (۴۸)

مولانا آزاد اپنی فطری افتاد، اپنے فکر و تصور، اپنے رجحانات و میلانات اور ذہنی اکتسابات کے تنوع کے لحاظ سے اس قدر غیر معمولی انسان تھے کہ بیک وقت نہ ہم ان کے جملہ فضائل و خصائص کا احصار کر سکتے ہیں۔ نہ ان کے دماغ کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے انکی ادبی، علمی، مذہبی و صحافتی خصوصیات کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کر سکتے ہیں۔ (۴۹) مولانا وقت کے بڑے پابند تھے اور اسی وجہ سے ان کے کئی معاصرین ان سے خفا رہتے تھے۔ بقول شورش کاشمیری:

''پابندیِ اوقات کا یہ حال تھا کہ ملیح آبادی کی روایت کے مطابق ایک دن پانچ بجے شام گاندھی جی آ گئے۔ مولانا کو خبر کی تو جیسے ہیں ہی نہیں، ٹس سے مس نہ ہوئے، فرمایا: ''اس وقت ملنے سے معذور ہوں کل صبح نو بجے تشریف لائیں''۔ گاندھی جی بھی مہاتما تھے ہشاش بشاش لوٹ گئے اور اگلے دن نو بجے صبح تشریف لائے''۔ (۵۰)

فقر و استغناء اور خودداری و غیرت میں بھی بے مثال تھے۔ انہوں نے عمر کا طویل حصہ تنگ حالی و عسرت میں گزارا۔ اگر چاہتے تو والد کی گدی سنبھال کر لاکھوں کے نذرانے وصول کر سکتے تھے اور اس میں بڑا اچھا بھلا گزارا ہو سکتا تھا۔ مگر اس باب میں مولانا کی رائے یہ تھی کہ فقر کسبِ حلال سے پیدا ہوتا ہے، اور ایمان کسبِ حلال کے بغیر ممکن نہیں۔ مریدوں کے نذرانوں پر شاہی ٹھاٹھ ضرور قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن فقر کا استغناء کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ (۵۱) باوجود عسرت و تنگدستی کے کبھی اپنے عقیدت مندوں حتیٰ کہ دوستوں کو بھی خبر نہ ہونے دیتے۔ اکثر ہندو، مسلمان اور پارسی ان کے قدموں میں دولت کا ڈھیر لگا سکتے تھے۔ لیکن انہیں یہ کسی حال میں گوارا نہ تھا۔ کوئی دس سال وزارت میں رہے، وفات پائی تو جو کپڑے تھے ان میں پیوند تھے اور بینک بیلنس صرف چند سو روپے تھا۔ (۵۲)

مولانا ذہانت و فطانت کا عجیب شاہکار تھے۔ جس عمر میں جو پڑھا وہ حافظہ میں تھا۔ ان کا دماغ انسائیکلوپیڈیا تھا۔ ہر چیز اس طرح یاد تھی کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحے بائیں یا دائیں طرف اتنی سطریں چھوڑ کر درج ہے اور کتاب کب پڑھی تھی۔ (۵۳) شاہ معین الدین ندویؒ نے ایک جگہ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ذہانت و ذکاوت، فہم و فراست، فکر و تدبر کی گہرائی، دیدہ وری و نکتہ رسی میں ان کا کوئی معاصر ان کا حریف نہ تھا۔ (۵۴) کانگریس کے اہم لیڈر سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ان کی ذہانت و عبقریت کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے وہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ لکھتے ہیں کہ مولانا کی ذہانت، فطانت، فراست، تدبر، علم اور سب کی گیرائی و گہرائی مجھ ایسے اکل کھرے انسان کے ردّ و قبول کی محتاج نہیں۔ وہ دمشق، بغداد اور دہلی کی مسلمان سلطنتوں کے عہد و کمال کی عبقریت کا آخری وجود ہیں۔ (۵۵)

مولانا نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ علم و ادب کا ماحول تھا۔ ان کے والدِ ماجد کو نادر کتب خریدنے کا شوق تھا اور اپنے

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

اس شوق کے باعث انہوں نے کئی ملکوں کی خاک چھانی۔بعض اوقات تو ایک کتاب کے حصول کے لئے مہینوں ایک جگہ قیام کرنا پڑتا۔تب کہیں جا کر وہ مل پاتی۔ بقول مولانا آزاد ان کے اس شوق کی انتہا یہ تھی کہ دنیا کے مرغوبات میں کوئی چیز انہیں اس درجہ مضطرب نہ کرتی جتنا وہ ایک کتاب کیلئے مضطرب ہوتے تھے۔ان کا سب سے بڑا مصرف کتابوں کی خریداری تھا۔ حجاز،عراق،مصر،شام اور قسطنطنیہ کے تمام بڑے کتب خانے ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ غیر ملکی لائبریریوں سے دوسو کتابوں کی نقلیں لائے تھے۔(۵۶)

قدرتی امر تھا کہ یہ وراثتی شوق اولاد میں بھی منتقل ہوتا۔چنانچہ مولانا نے اوائل عمر ہی سے ان میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اور یہ شوق ایسا پختہ ہوا کہ عربی وفارسی کی سیکڑوں کتابیں چاٹ ڈالیں۔اپنے اس شوق کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے کہ:

''میرا مطالعہ جوانی سے بہت پہلے جوان ہوگیا تھا۔۔۔میرے شوق کا یہ عالم تھا کہ ہر مطبوعہ ورق پڑھ ڈالتا ۔۔۔میں کتاب پڑھتا نہیں ہضم کرتا تھا،عربی پڑھی تو اس کا سارا ذخیرہ ہضم کرلیا۔فارسی پڑھی تو اس میں ڈوب گیا اب اردو کی راہ کھلی تو ایسی چیٹک لگی کہ اسی کا ہو گیا''۔(۵۷)

مولانا کے کتب خانے میں اردو،عربی،فارسی،انگریزی اور فرانسیسی زبان کی ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔انگریزی اور فرانسیسی زیادہ نہیں جانتے تھے لیکن اپنی قدرتی صلاحیتوں کی بدولت اس میں اتنی مہارت حاصل کرلی تھی کہ کسی کتاب کا مطالعہ کرسکیں۔اپنی ۶۸ سالہ زندگی میں جتنی کتب کا انہوں نے مطالعہ کیا ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد ۱۵۰۰۰ کے قریب بنتی ہے۔اوران میں سے بہت کم کتابیں ایسی ہوتیں جن کا مطالعہ الف تا یا نہ کیا ہو۔(۵۸)

مولانا تمام زندگی اپنوں کی ستم ظریفی کا شکار رہے۔لیکن ان کا صبر وتحمل اور برداشت ''صبر جمیل'' کا مجسم روپ تھا۔ان میں پہاڑوں کی سی استقامت زمین کا سا تحمل تھا۔ان پر پشت سے وار ہوتے رہے مگر انہوں نے اُف تک نہ کی۔مولانا نے برصغیر کے بٹوارے کی مخالفت کی تھی اور اس کی سزا انہیں مسلمانوں کے سب وشتم کی شکل میں ملی۔لیگ وکانگریس دو مختلف جماعتیں تھیں،ہر ایک کی اپنی سوچ اور مقاصد تھے مگر جو چیز ان دونوں میں مشترک تھی،وہ تھی ہندوستان کی آزادی۔آزاد ہونے کے بعد اس کی ہئیت وماہئیت کیا ہوگی؟ یہاں بنیادی اختلاف پیدا ہوتا تھا۔چنانچہ لیگ کی خواہش تھی کہ مسلمانوں کے لئے الگ وطن ہونا چاہئے۔کانگریس کی مسلمان قیادت کی سیاسی بصیرت یہ تقاضا کرتی تھی کہ ہندوستان اس طرح متحد رہے کہ ایک کنفیڈریشن کی صورت میں اکٹھا ہونے کے باوجود مسلمانوں کو آزادی کی دولت نصیب ہو۔اس اختلاف نے لیگ و کانگریس میں ایسی خلیج قائم کردی کہ ہندوستان کی آزادی سے پہلے ہی دونوں جماعتیں ایک دوسرے کی رقیب بن گئیں۔لیگ خالص مسلم جماعت کی حیثیت سے اور کانگریس ہندو جماعت کی حیثیت سے متعارف ہوئیں،حالانکہ کانگریس میں مسلمان لیڈروں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔اس اختلاف کا نتیجہ ایسا خوف ناک تھا کہ جس کے تصور سے ہی روح کانپ جاتی ہے۔قتل وغارت گری اور ظلم وستم کا ایسا بازار گرم ہوا کہ **الامان الحفیظ**۔

مولانا نے لیگ کی پالیسیوں کی مخالفت کی تھی۔چنانچہ اس کا صلہ ان کو لیگ کی جانب سے ہندوؤں کا زرخرید غلام اور شو

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

بوائے کے القابات سے نواز کر دیا گیا۔ان الزامات کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کی بجائے انہوں نے جس صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جولوگ مولانا کو قائداعظم کا دشمن جانتے ہیں انہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ سیاسی مخاصمت کے باوجود مولانا دل میں ان کے لئے عزت واحترام کا گوشہ رکھتے تھے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۵۱ء میں ایران کے دورے سے واپسی پر مولانا کچھ دیر کراچی ائرپورٹ پر ٹھہرے اور مزارِ قائد پر جا کر فاتحہ خوانی بھی کی۔ جون ۱۹۴۷ء میں قائداعظم سے متعلق ایک سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا:

''تاریخ کا انتظار کرو۔اصل فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے کہ ہندوستان مسلمانوں کے مسئلے کا حل ''تقسیم'' صحیح تھا یا غلط؟ لیکن مسٹر جناح نے ردِعمل کا شکار ہوکر یہ راہ اختیار کی ہے۔ورنہ وہ اکل کھرے ہندوستانی اور سچے سیاست دان تھے۔ بہرحال ان کی اس خصوصیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی عصبیت کو فولاد کر دیا''۔(۵۹)

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے قبل مولانا نے اس کی شدید اور پُرزور مخالفت کی تھی۔لیکن جب ہزاروں مائیں، بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتوں اور بے گناہ ومعصوم انسانوں کا خون بہنے کے بعد یہ ملک حاصل کرلیا گیا تو بجائے روائتی حریف کی طرح اس مخالفت کو برقرار رکھنے کے، مولانا نے اسے دل سے نہ صرف یہ کہ قبول کرلیا بلکہ اس کے استحکام اور مضبوطی کی تمناؤں سے اس کا اظہار بھی کیا۔ پروفیسر محمد منور نے مولانا کے یہ الفاظ ایک جگہ نقل کئے ہیں کہ:

''میرے بھائی ہم نے تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی، اور کئی اسباب میں سے ایک سبب اس مخالفت کا یہ خوف بھی تھا کہ اس تقسیم کے ساتھ ملتِ اسلامیہ ہند بھی تقسیم ہوجائے گی اور اس کی طاقت گھٹ جائے گی، مگر ملت کی اکثریت نے ہماری رائے کے خلاف فیصلہ دیا، ہم ہار گئے اور پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ پاکستان معرضِ وجود میں نہ آتا تو اور بات تھی اور اب ظہور میں آ گیا ہے تو ہر دوسرے اسلامی ملک سے بڑھ کر عزیز ہے۔اب اسے باقی رہنا چاہئے۔اس کا بن کر بگڑ جانا سارے عالمِ اسلام کی شکست کے برابر ہوگا''۔(۶۰)

مولانا اگر محض سیاستدان ہوتے تو ممکن تھا وہ اپنے گردوپیش کے حالات سے سمجھوتہ کر لیتے۔لیکن وہ سیاستدان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دردمند دل رکھنے والے محبّ وطن انسان بھی تھے، جو ایک سیاستدان کی طرح محض اپنا مفاد عزیز رکھنے کی بجائے اپنے ہم وطنوں کے مستقبل کے بارے میں بھی متفکر رہتا ہے۔ وہ تمام زندگی ہندوستان کی غلامی کی زنجیریں توڑنے میں مصروف رہے، مگر جب یہ نعمتِ غیر مترقبہ نصیب ہوئی تو اس کی جغرافیائی حدود وقیود ان کی منشاء کے مطابق نہیں تھی۔انہیں غیروں سے زیادہ اپنوں نے زخم لگائے۔اور یہی غم انہیں اندر ہی اندر گھلاتا رہا۔غرض آزادی کے بعد ان کا حوصلہ، ولولہ اور جوش وخروش بالکل ماند پڑ گیا اور وہ اپنی بقیہ زندگی کے دن اسی کرب واذیت میں کاٹنے لگے۔

۱۹فروری ۱۹۵۸ء کو آل انڈیا ریڈیو نے خبر دی کہ مولانا آزاد علیل ہوگئے ہیں۔اس رات کابینہ کے اجلاس سے لوٹے تو بالکل ہشاش بشاش تھے، صبح عادت کے موافق اٹھے اور غسل خانے تشریف لے گئے یہیں فالج کا حملہ ہوا۔ جواہر لال نہرو اور

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

رادھا کرشنن فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ڈاکٹروں کی قطار لگ گئی۔مولانا بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ڈاکٹروں نے کہا کہ ۴۸ گھنٹے گزرنے کے بعد وہ کوئی رائے دے سکیں گے۔اس مرض الموت میں جواہر لال نہرو، بابو راجندر پرشاد، مولانا کی ہمشیرہ آرزو بیگم، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا کے سیکرٹری اجمل خان ان کے پاس تھے۔مرض الموت کے اس تمام عرصہ میں مولانا عموماً بے ہوش رہے۔کبھی کبھار ہونٹوں میں جنبش ہوتی اور آیتِ قرانی کے ورد کا سراغ ملتا۔شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ:''ڈاکٹروں نے ۲۱ کی صبح ہی کو ان کے جسم کی موت کا اعلان کر دیا تھا۔وہ حیران تھے کہ جسم کی موت کے بعد دماغ کیونکر ۲۴ گھنٹے زندہ رہا۔اس تضاد میں بھی زندگی کی امید باقی تھی۔ڈاکٹر بدھان چندرائے نے انجیکشن دینا چاہا تو مولانا نے آنکھیں کھولیں، فرمایا: **''ڈاکٹر صاحب اب اللہ پر چھوڑیے۔''**

پھر آنکھیں بند کرلیں۔۔۔ادھر وسطِ شب سے پہلے حالت نازک سے نازک ہوتی گئی۔پنڈت جواہر لال پائنتی کی طرف آکر کھڑے ہوئے تو آنکھوں کے نم کو سہارا دیتے ہوئے راجندر بابو نے کہا۔''مولانا پنڈت جی آئے ہیں''۔لیکن ابوالکلام موت سے لڑ رہا تھا۔راجندر بابو نے دوبارہ کہا۔سہ بارہ کہا۔چوتھی دفعہ مولانا نے آنکھیں کھولیں اور کہا:**''اچھا بھائی خدا حافظ!''**(۶۱)

یہ وہ آخری الفاظ تھے، جو مولانا کی زبان سے ادا ہوئے۔۲۲ر فروری کو بالآخر وہ شخص ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔جس کی زبان اور قلم نے ایک طویل عرصہ برطانوی سامراج کے خلاف شعلے اگلے تھے۔انتقال رات سوا دو بجے ہوا، صبح تک یہ خبر تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔مولانا کے دیگر رفقاء کی طرح جواہر لال نہرو کا بھی یہی خیال کہ مولانا تمام زندگی عوام سے کھچے رہے لہذا ان کے جنازہ میں بھی خواص ہی ہونگیں۔مگر ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی قریب دو لاکھ کے قریب لوگوں کا مجمع مکان کے باہر جمع ہوگیا۔ہر کوئی غمزدہ تھا۔ہر ایک کے چہرے پر حزن و ملال تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے دہلی شہر کا تمام کاروبار بند ہوگیا۔ایسی ہڑتال دہلی کی تاریخ میں دیکھنے کو نہیں ملی۔جنازہ ان کے اسی مکان سے اٹھایا گیا۔پہلا کندھا عرب ممالک کے سفراء نے دیا اس موقع پر جواہر لال نہرو، جنرل شاہ نواز، خان محمد یونس خان، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور راجندر پرشاد وغیرہ بھی موجود تھے۔

بھارتی فوج کے چیف آف سٹاف جنازہ کے دائیں بائیں تھے اور صدر جمہوریہ و نائب صدر کی گاڑی جنازہ گاڑی کے پیچھے تھی۔جنازہ کو پریڈ گراؤنڈ میں لیجایا گیا، جہاں محتاط اندازے کے مطابق پانچ لاکھ لوگ جمع تھے۔سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی اقتداء میں ٹھیک دو بجکر پچاس منٹ (۲:۵۰) پر نماز جنازہ ادا کی گئی۔شورش کاشمیری کے مطابق مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تحریک پر لال قلعہ اور جامع مسجد کے قلب کی پریڈ گراؤنڈ میں سرمد شہید کی قبر کے عقبی میدان کو قبر کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔چنانچہ یہیں دفن کیے گئے۔مولانا احمد سعید نے قبر میں اتارا اور سفید کھدر میں لپٹا ایک قیمتی وجود زمین کے سپرد کر دیا۔مولانا کی قبر جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان بنائی گئی تھی۔اس پر تبصرہ کرتے ہوئے شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''راقم الحروف کا یہ عقیدہ ہے کہ اقبال اور ابوالکلام اس صدی کے بہت بڑے مسلمان اور عبقری دماغ تھے۔دونوں کا سیاسی میدان ہمیشہ ہی مختلف رہا۔لیکن عوام کی بھیڑ سے کنارہ کیا اقبال کو شاہی مسجد لاہور کے

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

پہلو میں جگہ ملی۔۔۔ابوالکلام کو جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان قلب میں جگہ ملی کہ مولانا دونوں عمارتوں کے شکوہ کی انسانی تصویر تھے'۔(۶۲)

مولانا نے باقاعدہ تصنیف کے میدان میں کوئی وسیع ذخیرہ تو نہیں چھوڑا البتہ جو کچھ بھی لکھا وہ ان کی عبقریت کا گواہ ہے۔ان باقاعدہ تصنیفات میں جو کتب شامل ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ قول فیصل (۶۳) ۲۔ غبار خاطر (۶۴)

۳۔ تذکرہ (۶۵) ۴۔ ترجمان القرآن (۶۶)

ان کے علاوہ وہ کتب جو مکمل یا نامکمل حالت میں رانچی میں ان کے گھر کی تلاشی کے دوران ضائع ہوگئیں ان کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ تاریخ معتزلہ ۲۔ وحدت قوانین کائنات

۳۔ سیرت شاہ ولی اللہ ۴۔ الکلم الطیب

۵۔ امثال القرآن ۶۔ القول الثابت

۷۔ خصائص مسلم ۸۔ سیرت مجدد الف ثانیؒ

یہ سب کچھ دوران تلاشی ضائع ہوگیا۔یہ نقصان صرف مولانا کا نہیں تھا بلکہ پوری عالم انسانیت کا نقصان تھا۔جس کے دل و دماغ کی تیرگی اور فکر ونظر کی ژولیدگی کے لئے خدا جانے روشنی اور سلجھاؤ کے کیسے کیسے سامان تھے۔ان کتب کے علاوہ بیسیوں کتب ایسی ہیں جو ان کے وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے مقالات کو کتابی شکل دے کر شائع کی گئیں۔ان میں سے بعض مقالات تو اپنی شہرت کے باعث کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے۔پاکستان میں مولانا پر کما حقہ تحقیقی نوعیت کا کام نہیں ہوا البتہ ایک محتاط اندازے کے مطابق اب تک ہندوستان میں مولانا پر لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد ۵۰۰ کے لگ بھگ ہے۔مولانا پر بہت سے رسائل نے خصوصی نمبر بھی نکالے۔ان میں سے احاطہ مطالعہ میں آنے والے نمبروں کی فہرست پیش کی جاتی ہے تاکہ محققین ان سے استفادہ کرسکیں۔

☆ آجکل (دہلی) ابوالکلام نمبر جلد ۱۷، اگست ۱۹۵۸ء ☆ آجکل (دہلی) ابوالکلام نمبر جلد ۴۷، نومبر ۱۹۸۸ء

☆ اردو ادب (علی گڑھ) آزاد نمبر جلد ۸، ۱۹۵۹ء ☆ الجمیعۃ (دہلی) آزاد نمبر ۴، دسمبر ۱۹۵۸ء

☆ جامعہ (نئی دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر جلد ۴۸، مارچ ۱۹۶۳ء ☆ صبح (دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر ۱۹۷۰ء

☆ چٹان (لاہور) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر جلد ۱۸، فروری ۱۹۶۵ء ☆ صبا (حیدرآباد) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر جلد، ۱۹۵۹ء

☆ ماحول (کراچی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر ۶، ستمبر ۱۹۶۰ء ☆ معارف (اعظم گڑھ) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر ۱۹۵۳ء

☆ ایوان اردو (دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر جلد ۲، دسمبر ۱۹۸۸ء ☆ فکر ونظر (علی گڑھ یونیورسٹی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر ۱۹۸۹ء

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ابوالکلام آزاد، تذکرہ، مکتبہ جمال، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۹

۲۔ افضل حق قرشی، ابوالکلام آزاد ادبی و شخصی مطالعہ، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۷۰۔ مولانا کی درج ذیل چار کتب ۱۔ حفظ المتین عن نصوص الدین ۲۔ خیرالامصار مدینة الانصار ۳۔ الستة الضرورية فی المعارف الخيورية ٤۔ اسباب السرور لاصحاب الخيور کو محمد ضیاالحسن قادری نے ترتیب دے کر مکتبہ دارالاسلام، ۸۔سی محی الدین بلڈنگ، داتا دربار مارکیٹ لاہور سے شائع کیا ہے۔

۳۔ ابوالکلام آزاد، تذکرہ، ص ۳۱۱-۳۱۲

۴۔ ابوسلمان شاہجہانپوری، مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۷۰

۵۔ ابوالکلام آزاد، تذکرہ، ص ۳۱۱-۳۱۲ ۶۔ ایضاً

۷۔ شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، مطبوعات چٹان، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۲۴

۸۔ ایضاً ۹۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۰۔ ایضاً ۱۱۔ ایضاً، ص ۲۶

۱۲۔ ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، مکتبہ رشیدیہ، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۹-۱۴۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۶ ۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۱۵۔ ایضاً ۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵۹-۱۶۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۶۲ ۱۸۔ ذکر آزاد، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۵۹

۱۹۔ ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۱۹ ۲۰۔ ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، ص ۹۳

۲۱۔ ایضاً، ص ۹۵ ۲۲۔ ایضاً، ص ۱۷۱

۲۳۔ شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، ص ۳۰-۳۱ ۲۴۔ الہلال (کلکتہ)، شمارہ ۱، ص ۲۴

۲۵۔ عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، مکتبہ رشیدیہ، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۷۷

۲۶۔ دیکھئے شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، ص ۵۱۔ حکیم محمد اجمل خان نے ندوہ کے سالانہ اجلاس میں جب یہ فرمایا تھا تو بالکل درست فرمایا تھا کہ ابتدائے اسلام سے عذر ۱۸۵۷ء تک جس قدر تکفیر کے فتوے لکھے گئے اگر انہیں ایک جلد میں جمع کیا جائے تو ہرگز اس جلد کی ضخامت اس جلد کے برابر نہ اٹھے گی جو ۱۸۵۷ء سے لیکر آج تک کفر کے فتووں کو جمع کیا جائے تو بدون ہوگی۔

۲۷۔ شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، ص ۱۰۶ ۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، ص ۳۱۰ ۳۰۔ شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، ص ۱۰۶

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۰۷ ۳۲۔ حوالہ سابق، ص ۳۸۹۔۳۹۰

۳۳۔ ایضاً، ص ۴۵۷

۳۴۔ اصغر مغل، مولانا ابوالکلام آزاد کے ادبی شاہ پارے، دارالاشاعت، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۷۷

۳۵۔ ایضاً ۳۶۔ ابوالکلام آزاد، قول فیصل، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۶۸۔۶۹

۳۷۔ شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، ص ۲۴۲ ۳۸۔ آج کل (دہلی)، شمارہ ستمبر ۱۹۵۹ء

۳۹۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ج ۱، ص ۴۴۳- مکاتیب شبلی، ص ۲۶۳

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.

۴۰۔ ابوسلمان شاہجہانپوری، مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ، ص ۱۲۴

۴۱۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۵۰۱

۴۲۔ ان تقاریر کا سب سے پہلا مجموعہ شورش کاشمیری نے خطبات آزاد کے نام سے شائع کیا تھا۔ بعدازاں بہت سے لوگوں نے الہلال میں چھپنے والے مولانا کے خطبات کے مختلف مجموعے شائع کئے۔

۴۳۔ ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، ص ۱۴۳ ۴۴۔ اصغر مغل، ابوالکلام آزاد کے ادبی شہہ پارے، ص ۲۹۷

۴۵۔ الہلال (کلکتہ)، شمارہ جنوری ۱۹۱۳ء، ص ۱۳ ۴۶۔ عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، ص ۶۰-۶۱

۴۷۔ ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، ص ۱۰۱ ۴۸۔ عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، ص ۶۰

۴۹۔ آج کل (دہلی)، ابوالکلام نمبر، اگست ۱۹۵۸ء، ص ۱۷ ۵۰۔ شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، ص ۸۴

۵۱۔ ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، ص ۵۲ ۵۲۔ ایضاً، ص ۵۷

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۰۰ ۵۴۔ معارف (اعظم گڑھ)، شمارہ مارچ ۱۹۵۸ء، ص ۸۱

۵۵۔ شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، ص ۴۷۶ ۵۶۔ ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، ص ۷۰

۵۷۔ ایضاً، ص ۷۱ ۵۸۔ ایضاً، ص ۷۴

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۰۱ ۶۰۔ نوائے وقت (لاہور)، ۲۳، مارچ ۱۹۷۲ء

۶۱۔ شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، ص ۹۷ ۶۲۔ چٹان (لاہور)، ۳/ مارچ ۱۹۵۸ء

۶۳۔ ۱۰/دسمبر ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت کے حوالے سے مولانا کو دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ اس مقدمہ کی سماعت ۱۳/دسمبر کو شروع ہوئی۔ ۲۴/جنوری ۱۹۲۲ء میں مولانا نے اپنا بیان داخل عدالت کیا۔ یہ وہی بیان ہے جسے بعدازاں قول فیصل کے نام سے شائع کیا گیا۔ مہاتما گاندھی کے بقول ''مولانا آزاد کا عدالتی بیان ایک عظیم بیان ہے'' قول فیصل کا عربی ترجمہ'' **ثورة الهندالسياسته**'' کے نام سے مطبع المنارہ قاہرہ نے ۱۳۴۱ھ میں چھاپا تھا۔

۶۴۔ تذکرہ مولانا کی شہرہ آفاق کتاب ہے۔ یہ کتاب جون/۱۹۱۶ء سے ۱۷/اکتوبر ۱۹۱۶ء کے درمیانی عرصہ میں لکھی گئی۔ کتاب کا اصل مسودہ موجودہ کتاب سے دوگنا تھا۔ مگر فضل الدین احمد (جن کی تحریک پر یہ کتاب لکھی تھی) نے نامعلوم کس بناء پر باقی مسودہ کو دوسری جلد میں شائع نہ کیا۔ اور یوں اس کتاب کے انتہائی اہم مباحث یعنی مولانا کی خودنوشت سوانح حیات کا حصہ ضائع ہوگیا۔

۶۵۔ غبار خاطر مولانا کے وہ خطوط ہیں جو قلعہ احمد نگر کی اسارت کے دوران مولانا حبیب شروانی کے نام لکھے گئے۔ کتب میں کل ۲۴، خطوط شامل ہیں۔ اوران میں سے ہر خط اپنی جداگانہ ادبی شناخت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا کا قلم ادب میں انتہائی بلند اور نمایاں مقام حاصل ہے۔

۶۶۔ ترجمان القرآن مولانا کی نامکمل تفسیر ہے۔ مولانا کی خواہش تھی کہ یہ تفسیر تین حصوں میں منقسم ہو۔ مقدمہ تفسیر، تفسیر البیان اور ترجمان القرآن۔ ان میں سے آخری حصہ سب سے پہلے شائع ہوا کیونکہ اس کی ضرورت پہلے ذکر کئے گئے دونوں حصوں سے زیادہ تھی۔ مولانا نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچالیا تھا لیکن یہ حکومت برطانیہ کے ایجنسیوں کی تلاشی میں ضائع ہوگیا۔ موجودہ مسودہ سورۃ المومنون تک کا ہے۔

This document was created by an application that isn't licensed to use novaPDF.
Purchase a license to generate PDF files without this notice.